حوالہ جات

(۱) محبوب ظفر، پاکستان ادب کے معمار احمد فراز شخصیت اور فن، ص۱۶۹

(۲) طارق نعیم، نذہت اکبر (مدیر)، کتاب بیادِ احمد فراز (رسالہ) جلد ۴۱- ۴۰ص۲۹

www.bazm.urduanjuman.com(۳)

(۴) اشفاق حسین، احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق، ص۱۲۰- ۱۱۹

(۵) ساجدہ اقبال سید (چیئر پرسن) ماہِ نو (رسالہ) ص ۳۳۰

(۶) ساجدہ اقبال سید (چیئر پرسن) ماہِ نو (رسالہ) ص۲۶۵

(۷) ساجدہ اقبال سید (چیئر پرسن) ماہِ نو (رسالہ) ص۱۴

(۸) محبوب ظفر، احمد فراز ز شخصیت اور فن، ص۵۶

کتابیات

(۱) اشفاق حسین "احمد فراز یادوں کا ایک سنہرا ورق" وجدان پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۹ء

(۲) محبوب ظفر، "پاکستانی ادب کے معمار احمد فراز شخصیت اور فن" اکادمی ادبیات اسلام آباد اشاعت دوم ۲۰۱۶ء

(۳) محبوب ظفر "احمد فراز شخصیت اور فن" اکادمی ادبیات اسلام آباد اشاعت اول ۲۰۰۶ء

اردو رسائل

(۱) ساجدہ اقبال سید چیئر پرسن "ماہِ نو"

(۲) طارق نعیم، نذہت اکبر (مدیر) "کتاب بیادِ احمد فراز" جلد ۴۱-۴۰، ۵۷- ۵۶ شادمان لاہور اکتوبر ۲۰۰۸ء تا اپریل ۲۰۰۹ء

میں ۷ ۴۲اور آخری مجموعہ کلام میں سب مجموعہ ہائے کلام سے زیادہ ۹۱ غزلیں درج ہیں۔

ان تمام غزلوں میں احمد فراز کی فنی پختگی نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں میں کم و بیش وہی تراکیب نئے انداز سے استعمال ہوئی ہیں جو غالب اقبال اور فیض کے ہاں ملتی ہیں مثلاً گرمیءِ بازار، دستِ صبا، سلاسل، زنداں، دارورس، تیر و تلوار، متاعِ نیاز، قفس، پیرہن، بدن، شب وغیرہ۔ ان کی غزلوں میں حوصلہ اور امید بھی ہے ان کے ہاں جذبہءِ حریت کا وقار ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان کا تخلیقی سفر جمہوری انقلابیت کے سائے میں جاری وساری رہا۔ ان کی غزلیں مرصع سازی کا بہترین شاہکار ہیں ان کے الفاظ شعر میں انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں جن میں ایک لفظ کے ردوبدل کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ فری اور تخلیقی حسین امتزاج ان کی غزلوں کو رنگین پیرہن عطا کرتا ہے۔ ان کی گزلوں کا فنی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی فنی پختگی اور ہنرمندی کو ثابت کیا ہے ان کی غزلیں اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں اور قوم پرستی اور تنگ نظری سے بالاتر ہیں اور انسان دوسری کی امین ہیں۔ ان کی غزلیں محسوسات کا عکس ہیں۔ داخلی اور خارجی کیفیات کو انہوں نے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے ان کی غزلیں سچائی اور شجاعت کی امین ہیں۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں وہ معاشرتی بدحالی اور انسانی معاشرے میں انسانوں کے ہاتھوں انسانوں کا استحصال دیکھ کر آزردہ نہیں ہوئے بلکہ درخشاں مستقبل کی امید دلارے ہیں۔ ان کی غزلوں میں حقیقت نگاری ملتی ہے۔ غاصب حکمرانوں کے خوف سے انہوں نے جھوٹ اور منافقت کا سہاراق نہیں لیانہ ہی مصلحت کوشی سے کام لیا۔ ان کی غزلوں کے اشعار میں بھی جرأت وبہادری کی جھلک ہے۔ احمد فراز کی غزلیں ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں اظہار و بیان اور زبان پر عبور حاصل ہے حالانکہ ان کی مادری زبان پشتو تھی مگر اردو زبان پر انہیں کمال قدرت حاصل تھی جو اہل زبان شعراء کو بھی کم حاصل ہوتی ہے۔ الغرض احمد فراز کی غزلیں عمدہ اشعار کا رنگین پیرہن لئے ہوئے گزل گوئی نے ہی احمد فراز کو زیادہ شہرت و مقبولیت عطا کی۔

لب کشالوگ ہیں، سرکار کو کیا بولنا

اب لہو بولے گا تلوار کو کیا بولنا

جب ہر اک شہر بلاؤں کا ٹھکانہ بن جائے

کیا خبر کون کہاں کس کا نشانہ بن جائے

فراز کی غزلوں میں ''تنہا تنہا'' سے لے کر اُن کے آخری مجموعہ کلام ''اے عشق جنوں پیشہ'' میں تمکنت اور دلنشی یکساں ہے 60 برس تک خوبصورت شاعری کرنے والے شاعر نے تسلسل کے ساتھ غزل کو نکھارا ان کی غزلوں میں نئے افکار مچلتے جذبات خوبصورت احساسات و جذبات اور بولنے، الفاظ کے دھنک رنگ موجود ہیں۔ وہ ہمارے معاشرتی حالات وواقعات ظلم وجبر اور استبداد سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں ان حالات میں بولنے والے کی زبان تک کاٹ دی جاسکتی ہے۔ بقول فتح محمد ملک۔۔۔
'' احمد فراز اس عذاب الیم سے ہمیں ڈرانے میں مصروف ہے جو ہمارے دروازوں اور ہماری سرحدوں پر دستک دے رہا ہے موجودہ حالات میں سچے شاعر کا فریضہ یہی ہے اور فراز نے یہ فریضہ موجودہ ماحول میں ٹھان رکھی ہے۔ ۷

ان کی غزل دلوں کو شادوآباد رکھتی ہے۔ اہل دلی عشق و محبت کے اظہار کے لئے فراز کی غزلوں کے اشعار استعمال کرتے ہیں گانے والے انہیں اپنا محسن مانتے ہیں یہ ان کا طرہ امتیاز ہے کہ جب تک اردو ہے احمد فراز اور اُن کی غزل زندہ ہے انہوں نے اردو شعری روایت کو انہی غزلوں کے ذریعہ کمال ہنر مندی سے آگے بڑھایا محبوب ظفر لکھتے ہیں میں سمجھتا ہوں۔
''اردو غزل اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اُسے فراز جیسا شاعر نصیب ہوا ہے بڑی حیران کن بات ہے کہ محبت جیسے قدیم موضوع کو بھی فراز نے تازگی اور وسعت دی ہے ان کی غزل میں ایک تمکنت اور شکوہ ہے وہ جس طرح غزل کے دشوار گزار راستے سے گزرے ہیں ان کے شعر خود ہی اس کی گواہی دے رہے ہیں فراز نے اردو شاعری کو جتنے زیادہ اور اچھے شعر دیئے وہ شاید ہی کسی اور شاعر کے حصے میں آئے ہوں۔'' ۸

الغرض فراز کی غزلیں اپنے انداز ہر خصوصیت کا بحر بیکر اں لئے ہوئے ہیں ان کی غزلوں میں زندگی کے بارے میں وسیع تر اخلاقی اور سیاسی نقطہ نظر موجود ہے۔ احمد فراز کی غزلوں میں رومانیت، احتجاج مزاہمت اور انقلاب کا رنگ نمایاں ہے اور غزلوں کے مطلع بھی انتہائی جان دار ہیں ان کی غزلوں میں غنائیت اور ردھم بھی ہے اور مترنم ردیفوں کا استعمال کر کے انہوں نے غزلوں کو موسیقیت عطا کی ہے۔ الفاظ کا چناؤ انتہائی سلیقے اور قرینے سے کیا گیا ہے اور زبان سادہ اور سہل ہے جو عام قاری اور سامع کے لئے ذود فہم ہے۔ انہیں ذخیرہ الفاظ پر بھی عبور حاصل ہے غزلوں میں تشبیہات اور استعارے بھی استعمال کیے گئے ہیں اور علامت نگاری بھی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں عیوب شاعری نہیں ہے۔ کلاسیقیت اور جدت پسندی کے حسین امتزاج سے انہوں نے غزلیں تخلیق کی ہیں۔ محبت جیسے قدیم موضوع کو اور روایتی موضوع کو انہوں نے ندرت بخشی ہے۔ ان کی رومانوی غزلوں میں عامیانہ پن اور سطحی انداز نہیں ہے۔ ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام میں چھپنے والی کل گزلوں کی تعداد ۵۱۷ ہے۔ بالترتیب پہلے مجموعہ کلام میں ۴۲ دوسرے میں ۴۴ تیسرے میں ۲۸ آٹھویں میں ۴۵ دسویں میں ۴۹ بارہویں میں ۴۰ تیرھویں میں ۳۷، کلیات

احمد فراز کے غزلیں مرصع سازی کا بہترین شاہکار ہیں۔ ان کے اشعار الفاظ کے زیور سے آراستہ ہو کر دیدہ زیب نظر آتے ہیں الفاظ کے چناؤ میں مہارت کی وجہ سے شعر کی لفظی کیفیات موزونیت قاری کو لطف اندوز کرتی ہے اُن کے اشعار میں استعمال ہونے والا ہر لفظ منہ بولتی تصویر بن جاتا اور اُن کے الفاظ شعر کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں احمد ندیم قاسمی نے احمد فراز کی غزل گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''احمد فراز کی غزل دراصل صنفِ غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے اس کا ایک ایک مصرع ایسا گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا اس کی غزل تکمیل (Perfection) کی انتہا ہے'' ۵

فراز کیا اشعار میں تلخی اُن کی صداقت اور خلوص کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے کیونکہ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اس کا لہجہ تلخ اور بلند آواز ہوتی ہے فراز کا سچائی پر مکمل ایمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے اردگرد کسانوں کی زبوحالی، مزدوروں کی عزت مظلوموں کی بے بسی، تنگدستوں اور فاقہ کشوں کی لفظی تصویر کشی بھی اپنے اشعار میں کی ہے اور الفاظ اسقدر دل سوز ہیں کہ اُن کو پڑھ کر سنگ دل شخص بھی اشکبار ہو جاتا ہے۔

احمد فراز کی غزلوں کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا بنیادی اسلوب استعاراتی اور علامتی ہے ان کے استعارات میں معاشرتی، سیاسی تہذیبی اور عشق و محبت کا عکس ہے اور ان کے استعالات میں فنی رعنائی اور رومانیت کے علاوہ زندگی کے تلخ حقائق کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں مثلاً

چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے

پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر

احمد فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں وہ اپنی غزلوں میں باطنی زندگی کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں فکری اور تخلیقی فنوں کا حسین امتزاج اُن کی غزلوں کو رنگین پیراہن عطا کرتا ہے۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر ہیں وہ معاشرتی بدحالی انسانی معاشرے میں انسانوں کے ہاتھوں انسانون کو استحصال دیکھ کر آرزوہ ہوتے ہیں نہ مایوس ہوتے ہیں بلکہ وہ درخشاں مستقبل کی اُمید دلاتے ہیں اُن کی غزل سچائی اور شجاعت کی امین ہے انہوں نے حقیقت نگاری کو اپنا شیوہ بنایا اور غاصب حکمرانوں کے خوف سے انہوں نے کبھی جھوٹ اور منافقت کا سہارا نہیں لیا انہوں نے اہل وطن کی بے بسی و بے کسی کی زندگی کے غم کو اپنا غم سمجھ لیا اس سلسلے میں فیض احمد فیض لکھتے ہیں۔

''بیک وقت غم جاناں اور غم دوراں کی وسیع دنیاؤں سے آگہی اور اس کی تفسیر مشکل کام ہے لیکن احمد فراز اس کام میں بہت حد تک کامیاب ہے'' ۶۔

نمونے کے طور پر اُن کے آخری مجموعہ کلام اے عشق جنوں پیشہ سن اشاعت ۲۰۰۷ء کی غزلوں کے اشعار:

ان کی غزلوں میں عشق و محبت کے اظہار کا جو بے ساختہ پن ہے وہ کسی اور کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔ اُن کی غزل روایتی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور جدت ندرت اور تازہ کاری نے اُنہیں غزل گوئی میں وہ منفرد مقام عطا کیا جو ساٹھ دھائیوں سے بھی زیادہ عرصے تک قائم رہا اور اب تک قائم ہے۔ حسن و عشق کا والہانہ اظہار بھی انہی غزلوں میں کیا اور ظلم اور جبر سے متاثرہ لوگوں کے احساسات کا اظہار بھی اپنے اشعار میں کیا۔ ان کی ابتدائی غزلوں پر احمد ندیم قاسمی، فیض اور فراق کا رنگ نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر انہوں نے اپنا منفرد اسلوب اور فکر و فن اعلیٰ معیار اور انداز بنایا اُن کی غزلوں میں معاشرتی مسائل، اور انسانی الجھنوں کا اظہار ہے

اُن کے اشعار میں فکر و فن کی تازہ کاریاں ملتی ہیں مثلاً اُن کے یہ اشعار۔۔۔

مصنف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے
رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتا کیوں نہیں دیتے

احمد فراز کا تعلق متوسط طبقے سے تھا انہوں نے زندگی کے مسائل کا سامنا کیا تھا اُن کی غزلوں میں بھی انسان کی محرومیاں، شکستیں اور ناکامیوں اور ظلم میں پسنے کا عکس نظر آتا ہے اور پوری زندگی کا احاطہ کیا ہوئے ہیں۔ ان کی طرزِ فکر اور بصارت نے ان کے شعروں میں فصاحتِ کلام کا بھی خیال رکھا گیا ہے ان کی شعریت قابلِ صد تحسین ہے۔

ان کی غزلوں میں حوصلہ اور اُمید چھلکتا ہے ان کے ہاں جذبہ حریت کا وقار ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما نظر آتا ہے کیونکہ ان کا تخلیقی سفر جمہوری انقلابیت کے سائے میں جاری و ساری رہا ان کی ترقی پسندی اور جدیدیت نے اشتراکیت کے بجائے جمہوری قدروں کے فروغ اور فوجی آمروں کے جبر کے خلاف قلمی جہاد کیا۔ اُن کے اشعار میں جذبے کی شدت اپنے عروج پر نظر آتی ہے الفاظ کے چناؤ میں وہ اس قدر مہارت رکھتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مصرعے مجسمہ ساز کی طرح تراشے ہیں ان کے اشعار میں جو مزاحمتی اور انقلابی رویہ ہے وہ پاک سرزمین سے محبت کا جذبہ ہے اُن کے نزدیک وطن ایک ''محبوب'' کی طرح ہے وہ اُن منفی قوتوں کے خلاف اشعار کی صورت میں علم بغاوت بلند کرتے ہیں جو وطنِ عزیز پر جمہوری، انسانی، جمالیاتی، معاشرتی اور امن و آشتی کے منافی قوتوں کی صورت میں مسلط ہوتے ہیں ان کی غزلوں میں بھی وطن دشمن قوتوں کے خلاف ایک پُر اثر آواز ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حسن رضوی کو انٹرویو میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فراز کہتے ہیں۔

''صرف چند خبروں ہی سے نہیں چند کالموں سے بھی آگاہ ہوں میں جانتا ہوں کہ مجھ پر ملک دشمنی اور غیر محب وطن ہونے کے الزام لگائے گئے ہیں اگر میں غیر محب وطن ہوتا تو یوم پاکستان کی اس تقریب میں نظر نہ آتا جہاں تک پاکستان کے خلاف ہونے کی بات ہے تو تاریخ گواہ ہے ۶۵ کی جنگوں میں لکھے گئے میرے قومی نغمے اور ترانے شب خون کے نام سے شائع ہو چکے ہیں'' ۴

احمد فراز کے کلام میں رومانوی رنگ غالب ہے تاہم ان کی غزل میں نوکلاسیکی رنگ بھی نمایاں ہے۔ فیض احمد فیض کے برعکس ان کی غزلیں اردو اور فارسی کی خوشبو سے آراستہ ہیں۔ ان کی غزلیں سودا، میر، مصحفی، آتش اور مرزا غالب کے اسالیب کی پابند ہیں لیکن انہوں نے اساتذہ کی پیروی کرتے ہوئے اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھا۔ احمد فراز نے اساتذہ کی زمینوں میں بھی کافی غزلیں کہی ہیں احمد فراز کے تیرویں شعری مجموعے "غزل بہانہ کروں" میں تہتر غزلیں شامل ہیں اور جس میں سے بیشتر اساتذہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ جو خاصا مشکل کام ہے لیکن احمد فراز نے مرزا غالب اور میر جیسے بڑے شاعروں کی زمینوں میں بھی عمدہ غزلیں کہی ہیں اور اُن میں بہترین اشعار بھی نکالے ہیں لیکن انہوں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اس ضمن میں محبوب ظفر طراز ہیں:

"اساتذہ کی غزلوں پر غزل کہنا کوئی آسان بات نہیں لیکن فراز نے تو غالبؔ اور میرؔ جیسے شاعروں کی زمینوں میں بھی کمال شعر نکالے ہیں"

احمد فراز کو ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں کبھی "ٹین ایجرز کا شاعر قرار دیا جاتا رہا کبھی لڑکیوں کا دل پسند شاعر۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری ایک حد تک محبتوں کی شاعری بھی ہے ان کے اشعار میں رومان کے ختم ہوتے اور شروع ہونے کے سلسلے نظر آتے ہیں وہ اپنے رومان پرست مزاج کے بارے میں کہتے ہیں۔

"میں مانتا ہوں رومانس میری شخصیت کا ایک حصہ ہے اور میری شاعری میں اس کا غلبہ ہے لیکن زیادہ موضوعات ہیں۔ کہاں، کیا آپ مجھے محبت کے علاوہ کوئی موضوع بتا سکتے ہیں ہر شاعر عہدہ قدیم سے لے کر آج تک محبت کے موضوعات پر اپنے تجربات کی روشنی میں لکھ رہا ہے لیکن یہ موضوع پھر بھی نیا ہے" ۳

احمد فراز کی غزلوں میں جذبات کے اظہار کی شدت کے ساتھ ساتھ تازگی اور ندرت بیان بھی ہے اُن کی غزلوں میں عشق کا الاؤ دھکتا ہوا نظر آتا ہے اور بعض اُوقات بہتی ہوئی ندی کا اضطراب دکھائی دیتا ہے انہوں نے مترنم بحروں میں شاہکار غزلیں کہی ہیں۔ ان کی ایک شاہکار غزل اُن کے مجموعہ کلام خوابِ گل پریشاں ہے کی پہلی غزل جس کا مطلع ہے؛

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

(اس غزل کے ۲۲ شعر ہیں)

اردو کی بہترین غزلوں میں شمار کی جاتی ہے یہ غزل احمد فراز کو خود بھی بے حس پسند تھی۔ فراز کی غزلوں میں موسیقیت اور ترنم اور روانی ہر جگہ موجود ہے۔ ان کی غزلیں برصغیر پاک و ہند کے مشہور اور بڑے گلوکاروں نے گائی ہیں اور اُن کی شہرت میں اضافے کا سبب بھی بنی ہیں۔

احمد فراز کی غزلیہ شاعری کافنی و تحقیقی مطالعہ

(سیدہ زیب النساء)

خلاصہ

اس مضمون میں احمد فراز کی غزلیہ شاعری یعنی غزلوں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ احمد فراز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں نو کلاسیکی اور رومانوی رنگ نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں کے تجزیاتی اور فنی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے پہلے مجموعہ کلام "تنہا تنہا" لے کر آخری مجموعہ کلام" اے عشقِ جنون پیشہ " میں تمکنت اور دلنشینی یکساں ہے ان کی غزلیں فارسی اور اردو کی خشبو سے آراستہ ہیں۔ ان کی غزلیں اپنے اندر ہر حضومیت کا بحر بیکر اں لیے ہوئے ہیں۔ اردو غزل کو انہوں نے نہایت عمدہ اشعار دیئے۔ اردو زبان اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اُسے فراز جیسا منفرد غزلیں کہنے والا شاعر ملا۔

اردو شاعری ہماری تہذیبی روایات کا حصہ ہے۔ اردو شاعری اپنی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک مختلف ادوار سے گزری ہے اردو غزل کا بیج ولی دکن نے بویا تھا اور بعد میں آنے والے شعراء اس پودے کی آبیاری کرتے رہے۔ اردو ادب میں غزل محبوب ترین صنفِ سخن ہے۔ غزل گوئی قدیم اور جدید شعراء کا مشغلہ رہا ہے چنانچہ آج تک اردو شاعری کی تاریخ میں جتنے بھی شعراء گزرے ہیں انہوں نے اس صنفِ سخن میں ضرور طبع آزمائی کی ہے۔ غزل بنیادی طور پر جس قسم کے خیالات و جذبات نظریات و تاثرات کے بیان کا وسیلہ ہے اس کا تعلق خیال کی رعنائی موضوع کی خوبصورتی اور بیان کی دلکشی اور وجاہت سے ہے۔ غزل بنیادی طور پر نازک خیالی بلند پر وازی ندرت بیانی جدت طرازی معانی آفرینی اور لطافت انگیزی کا تقاضہ کرتی ہے۔ ایک بہترین اور معیاری غزل وہی ہو گی۔ جس میں یہ جملہ خوبیاں موجود ہوں گی چنانچہ دیکھا جائے تو اردو غزل نے بدلتے ہوئے تہذیبی دائروں میں جمالیاتی اظہار کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھا ہے۔

ہم احمد فراز کی غزل سنتے یا پڑھتے ہیں تو بلا مبالغہ اُن کی غزل بیان کردہ معیار پر پوری اُترتی ہے غزل فراز کی شناخت کا بنیادی حوالہ ہے۔ غزل کی روایت فراز کے ہاں متحرک اور رواں دواں چشمے کی مانند ہے ان کی غزل کا چہرہ ہمیشہ شاداب اور تروتازہ دکھائی دیتا ہے اُن کی غزلیں جذباتی تہذیب فکری ترفع اور فنی تکمیل کی عکاس ہیں۔ ان کی غزلوں میں جہاں روایتی تغزل ہے وہاں اخلاقی پہلو بھی ہیں۔ غزلوں کی زبان عام فہم اور سادہ ہے بیان میں روانی اور سلاست ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی غزلوں میں مضمون کی حد بندی نہیں بلکہ عالم انسانیت ان کے احاطہ فکر میں ہے وہ اپنی غزلوں میں حرکت اور توانائی لیے ہوئے ہیں۔ اردو زبان اس بات پر فخر کر سکتی ہے کہ اُسے فراز جیسا شاعر ملا۔ انہوں نے اردو کی شعری روایت کو سلیقے اور خلوص دل سے آگے بڑھایا اردو غزل کو احمد فراز نے نہایت عمدہ شعر دیئے ہیں۔ کنور مہنور سنگھ بیدی سحر احمد فراز کی غزل کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین سنگم ہے ان کی غزلیں اس تمام کرب والم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے" ا

۱۹۔اعجاز،راہی(۱۹۸٦)اردوزبان میں ترجمے کے مسائل،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،صفحہ نمبر۳۷

۲۰۔جیلانی،کامران پروفیسر(۱۹۸۵)ترجمہ روایت اور فن،مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،صفحہ نمبر۱۵

۲۱۔ایضاً۔۔۔۔۔۔صفحہ ۳۷

۲۲۔مرزا،حامد بیگ(۱۹۸۴)اردوادب سے انگریزی میں نثری تراجم،مقتدرہ قومی زبان،صفحہ نمبر۱۷تا۱۹

۲۳۔ایضاً۔۔۔۔۔۔صفحہ نمبر۱۹

حوالہ جات

1: ww.janan-e-urdu.com>Urdu-literature.

2: Translation studies; A brief history of the discipline.

۳۔ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (۱۹۶۲)، دانش گاہ پنجاب لاہور، صفحہ، ۲۰۲۔

۴۔ حاجی، احمد فخری، (۱۹۲۹) اردو سالہ، تاکدیم ۱۰

۵۔ نیو طالسطانی / حمید شاہد، (۱۹۹۳) جنگ اور امن، جلد اول، پولیمر پبلکیشرز لاہور، صفحہ نمبر ۲۸

۶۔ صوبیہ، سلیم ڈاکٹر، (۲۰۱۲) فن ترجمہ کاری (مباحث) ادارہ روغ قومی زبان پاکستان، صفحہ نمبر ۴۸

۷۔ جیلانی، کامران، پروفیسر (۱۹۸۵) ترجمہ روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، صفحہ نمبر ۱۹

۸۔ ای ض اَ۔۔۔۔۔ صعغل ح ہ

9: ww.janan-e-urdu.com>Urdu-literature.

10: ww.janan-e-urdu.com>Urdu-literature.

۱۱۔ جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵) ترجمہ روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، صفحہ نمبر ۳۰

۱۲۔ مرزا، حامد بیگ (۱۹۸۴) اردو ادب سے انگریزی میں نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، صفحہ نمبر ۱۹

۱۳۔ سید یر انور، ڈاکٹر، (۲۰۱۰) شخصیت اور فن پروفیسر سجاد نقوی، کادمی ادبیات پاکستان صفحہ نمبر ۷۶

۱۴: مرزا، حامد بیگ (۱۹۸۴) اردو ادب سے انگریزی میں نثری تراجم، مقتدرہ قومی زبان، صفحہ نمبر ۲۹

۱۵۔ عارف از ضیاء (۲۰۰۷) مضمون دو تراجم کی اہمیت وافادیت، روزنامہ جنگ کوئٹہ، براہوئی احوال

۱۶۔ حنیف، ابن (۱۹۹۶) بھولی بسری کہانیاں (یونانی)، بیکن بکن گل گشت ملتان، صفحہ نمبر ۴۷

۱۷۔ جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵) ترجمہ روایت اور فن، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، صفحہ نمبر ۳

۱۸۔ ایضاً۔۔۔۔۔ صفحہ نمبر ۳

فن کی بدولت ہوئی ہے۔ اس فن نے زروں کو سورج بننے کا شرف بخشا، یہ دو تہذیبوں کو ملانے کا وسیلہ ہے، قدیم سے لے کر جدید دور میں اس فن کی قدر وقیمت مسلم ہے۔

آج کے دور میں ترجمے کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ماہر زبان آج ترجمے کو تخلیق کا درجہ درے رہے ہیں۔ کیونکہ ناواقف زبان کے علمی خزائن کو اپنی زبان کے ڈالنا سننے میں شاہد آسان ہو لیکن اس کام کی انجام دہی بہت ہی مشکل امر ہے جیسے کوئی لکھاری اپنی تخلیق میں وہ قرب محسوس کرتا ہے اسی طرح ایک ترجمہ نگار بھی ترجمہ کرتے وقت اسے قرب سے دوچار ہوتا ہے۔

علم کی وسعت اور علمی دریافتوں کی کثرت سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچانے میں ترجموں نے بڑی مدد کی ہے۔ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں عربی کے تراجم کا بھی ہاتھ ہے ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعے علوم وفنون کے خزانے سب کے لئے کھل جاتے ہیں اسی لئے روزبزور ترجموں کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ترجمے نے بھی تخلیق کا درجہ پالیا ہے۔

ترجمہ ایک مستقل فن ہے جو بڑی ریاضیت چاہتا ہے اخبار، ریڈیو اور اب تدریسی ضرورتوں کے تحت اردو ترجموں کی مانگ بڑھتی جارہی ہے ایک دو یونیورسٹیوں میں ترجمے کے شعبے کھل گئے ہیں تو اس قیمت تخلیق کے ہم پلہ ہوتی ہیں اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں۔ ترجمہ علوم کا آکسیجن ہے۔

"عالمی سطح پر رابطوں کی بحالی اور مضبوطی کے لیے ترقی یافتہ اقوام میں بڑے پیمانے پر ٹرانسلیشن اور پروجیکٹ متحرک ہیں۔ جس کی دو مثالیں یونسیکو اور انٹرنیشنل فیڈریشن آف ٹرانسلیٹر(FIT)ہیں۔ امریکہ کا سب سے بڑا سائنسی ادارہ ناسا اپنے جریدے Star میں دنیا بھر کے خلائی تحقیقاتی کام کے تراجم شائع کرتا ہے۔ برطانیہ میں ترجمے کا سب سے بڑا مرکز برٹش لائبریری لینڈنگ ڈویژن ہے۔ جو فرمائش کرنے پر سماجی طبعی اور تکنیکی علوم کے تراجم فراہم کرتا ہے"۔

(مرزا، حامد بیگ(۱۹۸۴)اردو ادب سے انگریزی میں نثری تراجم، صفحہ ۱۷ تا ۱۹)

دنیا میں کئی اسے تراجم کے ادارے کھولے گئے ہیں جہاں صرف ترجمے کے کام ہوتے ہیں اور دنیا کی تمام تر تخالیق چاہے وعلمی، معاشرتی، یا ادبی ہوں ان کا خالص ترجمہ کیا جاتا ہے اور اس کام کے لئے پروفشنلز ترجمہ نگار بھی بروئے کار لا جاتے ہیں جیسے حامد بیگ نے اپنی کتاب "اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم"، میں ان اداروں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"امریکہ کا قومی مرکز ترجمہ نیشنل ٹرانسلیشنز نسٹر شکاگو ۱۹۵۳ء میں قائم ہوا یہ ادارہ سماجی اور طبعی علم کے علاوہ طب اور انجیرنگ س ے م ت ع ل ق م ش رق ی اور م غ رب ی زب ان وں س ے ت راج م ک اک ام ک رت اہ ے۔ اس ادارے س ے ت ق ری ب اَس اڑھ ے ت ی ل ادارے کے ماہوار جریدے کا نام Translation monthly ہے۔ امریکہ کا ایک بہت بڑا ادارہ American translation Association. جو ۱۹۵۹ء میں قائم ہوا اس ادارے کے مستقل ملازمین کے علاوہ تقریباً ۸۸ جریدے شائع ہوتے ہیں۔ جن کی تفصیل برٹش لائبریر لینڈنگ ڈویژن برطانیہ کی شائع کردہ کتاب(Journalism translation)میں ملاحظ کی جاسکتی ہے۔ سو کہا جاسکتا ہے۔ کہ دنیا کی بہت سے معاشرتی اور ذہنی تحریکیں ترجمہ کرنے والوں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ ترجمہ کی تحریکات عمل دونوں اعتبار سے اسلامی علمی دنیا میں حیرت انگریز طور پر نتیجہ خیز رہی ہے۔"

(ای ض اَص ف۱۹ا)ح ہ ن م ب ر

اوپر کی ہوئی تمام باتوں سے یہ اخذ کرنا قدرے آسان ہو گا کہ ترجمے کا فن کسی بھی ادبی معاشرے میں سنگ میل کا کام دیتی ہے۔ اس سے نہ صرف فکری تبادلہ ہوتا ہے بلکہ ثقافتی، تاریخ، اور علمی تبادلہ بھی ہوتا ہے۔ بہت سے ایسی نایاب و نادر کتابیں جو ایسی زبان میں لکھی ہوئی ہیں کہ جن کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے جیسے خطِ میخی لیکن ان کو سمجھنے کا واحد حل یا طریقہ ترجمہ کی مدد سے ہی ممکن ہے۔ یا بہت سے لوگوں کو ایک سے زیادہ زبانیں بولنی یا لکھنی نہیں آتیں تب ان لئے کئے علم کا ذخیرہ تر جمات کی ہی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لئے ترجمہ کرنا ہر دور میں ضروری امر سمجھا جاتا ہے۔

ماحصل

دنیا میں علم کی ترقی اس بات کی دلیل ہے۔ کہ تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس میں ترجمے سے لوگوں نے فائدہ نہیں اُٹھایا ہو۔ چاہے وہ ذریعہ ابلاغی ہو یا طب، فلکیات، مذہب، ادب، کلچر، فلسفہ، تاریخ، سائنس اور تجارت سب کی ترقی اس

(جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵)ترجمہ روایت اور فن، صفحہ ۳)

ُردو م ی ں ن ث رک ی اص ن اف ک ی ج ڑوں ک و پ ھ ی ل ان ے اور ک ون پ ل وں ک وپ ن پ ن ے ک ی اب ت داء ن ث ر ی
سے مختلف روایت سامنے آئی ہے۔ کچھ "سب رس" کو پہلا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ دیگر کتب کے حوالے سامنے آئے ہیں۔

"اردو میں نثری تراجم کا آغاز سترہوی صدی کے آغاز سے ہوتا ہے۔ عام طور پر سترہوں صدی میں ملاوجی کی سب رس ۱۶۳۵ء کو سب سے پہلی ترجمہ شدہ کتاب تصور کیا جاتا ہے۔ مگر تحقیقی اعتبار سے شاہ میر اں جی خدا نما (دکن) سب سے پہلے مترجم قرار پائے ہیں۔ جن کا تعلق قطب شاہی عہد سے تھا۔ جس نے عربی زبان کے مشہور مصنف الوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضا ہمدانی کی تصنیف "تمہیدت ہمدانی" کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اس ترجمے کا ایک نسخہ ۱۶۰۳ء میں لکھا گیا۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ کہ اُردو میں نثری تراجم کی روایت منظوم تراجم سے پہلے قائم ہوئی"۔

(جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵)ترجمہ روایت اور فن، صفحہ ۳)

ترجمہ نگاری نہ صرف معاشرتی علوم یا تاریخ مواد کا نہیں ہو تا بلکیں اسکا ایک بڑھ حصہ علمی وادبی بھی ہے اردو زبان میں آج کئی ہزار کتابیں چھپ چکی ہیں لیکن بغور مطالعہ سے یہ بات واضع ہو جائے گی کہ ان میں نصف سے زیادہ تراجم ہیں۔

"اُردو کے کلاسیکی ادب کا بڑا حصہ تراجم پر مشتمل ہے۔ خصوصا نثری ادب کی ابتداء ہی تراجم سے ہوئی ہے۔ سب رس، بل کتھا، نوطرز مرصع، باغ و بہار، آرائش محفل کے ترجمے فارسی سے کئے ہیں"

(اعجاز، راہی (۱۹۸۶) اردو زبان میں ترجمے کے مسائل، صفحہ نمبر ۳۷)

بیسویں صدی کے اوائل میں مذکورہ بالا تنظیموں کے علاوہ انفرادی طور پر بھی اُردو تراجم کا سلسلہ جاری رہا مغربی زبانوں کے ناول، افسانہ اور ڈرامے وغیرہ کو اُردو میں تراجم کا جامعہ پہنایا گیا۔ اُردو ترجمے کا دائرہ کاریوں وسیع ہوتا گیا"

(جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵)ترجمہ روایت اور فن، صفحہ ۱۵)

اردو ادب کے تمام نام چین لکھاری جہنوں نے اپنی تخالیق سے اردو ادب کے گوشے سرشار کئے ہوئے ہیں انہوں نے بھی اپنی ادبی زندگی میں کئی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے انہی لکھاریوں کا رتزکرہ کامران جیلانی نے کیا ہے۔

"بیسویں صدی کے اُردو ادب میں پریم چند راور سجاد حیدر یلدرم سے لیکر اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قراۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے نثری ادب کا ترجمہ کیا ہے"۔

(ای ض اَصی[illegible] ح ہ

ترجمہ کی اہمیت قدیم دور سے لے کر دور حاضر تک مسلم ہے۔ ترجمہ کی ضرورت دن بہ دن بڑتی جارہی ہے۔ آج تیز رفتار زندگی میں اس کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ ادب، سائنس ٹیکنالوجی اور دیگر شعبہ میں ترجمہ کے بغیر آگے بڑھنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

دوسروں تک پہنچانے سے ہمیشہ ادب میں بہتری کا راستہ سامنے آتا ہے۔ گل گامیش، الف لیلہ، کورش، حکایات سعدی، رومی خیام اور دیگر اہم تصنیفات سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔ تو وہ شمع ترجمہ ہی ہے۔

"کسی بھی زبان کے ادب میں تراجم کی اتنی اہمیت ہوتی ہے۔ جتنی تخلیقات کی بلکہ اگر معلوماتی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو تراجم کی اہمیت تخلیقات سے کچھ زیادہ اس لیے ہو جاتی ہے۔ کہ ہم تراجم کے زریعے دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب میں ہونے والے کام کے ساتھ ساتھ اس کے معیار اور اس زبان کے بولنے والوں کے فکری سطح اور ان کے علاقہ کے جغرافیائی حالات کے علاوہ تمدن اور ثقافت سے بھی آگاہی حاصل کر لیتے ہیں۔ کسی زبان کے ادب میں دنیا کی دیگر زبانوں کے عالمی معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یعنی تراجم وہ کسوٹی ہوتے ہیں۔ جن پر معیار کو پرکھا جاسکتا ہے، اور اس زبان وادب میں تخلیق کے لیے نئی راہوں اور فکری وفنی ضرورت کا تعین کیا جاسکتا ہے"

(عارف از ضیاء(۲۰۰۷) مضمون دو تراجم کی اہمیت وافادیت، روزنامہ جنگ کوئٹہ، براہوئی احوال)

اردو تراجم کی ابتدا:

دنیا کا کوئی بھی ادب ہو اس کا خمیر مختلف زبان وادب کے تخلیقات سے اثر ورسوخ اخذ واستفادہ کے بعد جامد شکل میں سامنے آئی ہے جو دور کسی بھی ادب کا عہد زریں رہا ہے۔ وہ ترجمے کے حوالے سے بھی اہم رہا ہے۔

"اس سے ظاہر کہ دنیا کا کوئی بھی ادب ہو وہ لسانی تہذیبی اثرات کے بنا پر مکمل ہوا ہے۔ یونان نے دیگر زبانوں سے اپنا وجود مضبوط کیا یورپی زبانوں نے یونانی زبان سے خود کے ادب کا نیو بنایا۔ انگریزی نے جرمنی، فرانسی سے خود کو سہارا دے کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور اُردو میں تو سنسکرت کی مٹی پہلے سے موجود تھی بعد میں اُنھوں نے یورپی زبانوں سے اثرات قبول کئے اور ہمارے ادیبوں نے فرانسی، روسی اور خاص کر انگریزی سے اپنے ادب کے وجود کو پختگی بخشی خصوص نثری ادب کا نیو اور ڈھانچہ مغربی زبانوں کا مرہون منت ہے۔ افسانوی ادب تو پورا کا پورا یورپی ادب کے کندھوں پر ہوتا ہوا اب خود کے پاؤں سے چل رہا ہے"۔

(حنیف، ابن (۱۹۹۶) بھولی بسری کہانیاں، صفحہ نمبر ۴۷)

اُردو ادب کی عمارت ترجمہ کا مرہوں منت ہے۔ شعری اصناف ہوں یا نثری اصناف دیگر زبانوں کے طفیل سے آئے ہیں۔ مٹی اپنی ہے مگر اس مٹی میں ادب کے درخت کو تناور کرنے میں ترجمہ نے اہم کردار ادا کیا۔

"اُردو زبان کا دامن بھی ترجمے سے خالی نہیں اُردو کی ابتدائی شعری اور نثری ادب کی عمارت زیادہ تر تراجم کی بنیاد پر استوار نظر آتی ہے۔ شاعری میں قدیم دکنی مثنویوں کا پلاٹ فارسی یا عربی سے لیا گیا۔ نثری ادب میں ابتدائی اُردو قصے بھی فارسی، عربی کی وساعت سے اُردو میں آئے"۔

ترجمہ کی ایک دوسرے کی ثقافت اور تاریخ کو جاننے کا ایک خاص ذریعہ ہے جسکے بارے میں حامد بیگ نے یوں رقم دراز کی ہے

''ترجمہ بجائے خود ایک تہذیبی منطقے کا حامل رہا ہے۔ اور اسی تہذیب کے بل بوتے پر انسانی تہذیبوں نے آپس میں بہت کچھ لین دین کیا ہے۔ وہ یوں کہ ترجمہ ایک زبان کے علمی اور ادبی سرمائے کو دوسروں کے تجربات سے فائدہ اُٹھانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان باہمی افہام و تفہیم اور ربط و ضبط کی راہیں کھولتا ہے۔ زبانوں کا فرق ہمیشہ سے مختلف قوموں اور گروہوں کے درمیان اتحاد و یگانگت میں ایک بڑی رکاوٹ رہا ہے۔ جبکہ ترجمہ کی تہذیب اس رکاوٹ کو دور کرتی ہے۔''

(مرزا، حامد بیگ (۱۹۸۴) اردو ادب سے انگریزی میں نثری تراجم، صفحہ نمبر ۱۹)

ترجمہ مختلف زبانین بولنے والوں کے درمیان پل کا کام کرتا ہے۔ بہت سے کلچر کو آپس میں جوڑتا ہے۔ ترجمہ ہی کی وجہ سے رکاوٹین ختم ہوتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کی جذبات بہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

''تراجم کسی بھی زبان کو ثروت مند بنانے کا بہترین وسیلہ ہیں۔ تراجم کا بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ ان کے ذریعے نہ صرف ہم دوسری زبانوں کے علوم اور فنون کو منتقل کرتے ہیں۔ بلکہ تراجم کی مدد سے اہم اسالیب اور تصورات کے لیے نئے ڈھانچے اپنی زبان کو فراہم کر دیتے ہیں۔ اور ترجمے کی داخلی ضرورت کے تحت نہ صرف الفاظ سازی کے عمل سے گزرتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی زبان کے اظہار میں وسعت پیدا ہوتی۔ لفظ و معنیٰ کا نیا ارتباط عمل میں آنے لگتا ہے''۔

(سدیر انور، ڈاکٹر، (۲۰۱۲) شخصیت اور فن پروفیسر سجاد نقوی، صفحہ نمبر ۷۶)

ترجمے کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات پر بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس سے نہ صرف یک زبان کا دوسرے زبان میں منتقل ہو رہی ہے بلکہ اس دوسرے زبان کے تمام اوصاف اور سب سے بڑھ کر فکری تبادلہ بھی ہو رہا ہے کیونکہ جو سوچ و فکر ایک شاہ پارے میں ہوتی ہے وہ شاید ہی دوسری قوم کے پاس ہو لیکن اسے شاہ پارے کی فکری سوچ کو اپنے زبان میں منتقل کرنا ترجمے کی ہی توسط سے ہو پاتا ہے۔

''نوزائیدہ اور ترقی یافتہ زبانوں میں علمی و فلسفانہ ابلاغ و اظہار میں ترجمے بڑھے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مترجمون ہی کی مدد سے کوئی زبان ابتداء میں گردوپیش کی زبانوں کا اثر و نفوذ قبول کرتی ہے۔ نئے الفاظ کو اخذ و انتخاب کرتی ہے۔ اور ترجموں ہی کی مدد سے اس میں بلحاظ ہیت و معنیٰ علمی و ادبی صباحت کے اظہار کا ذریعہ بننے کی صلاحیت اور قوت پیدا ہوتی ہے''

(مرزا، حامد بیگ (۱۹۸۴) اردو ادب سے انگریزی میں نثری تراجم، صفحہ نمبر ۲)

دن ادب آج ترقی یافتہ ہے۔ جہنوں کے ترجمے کو اپنایا ہے کسی بھی ادب کی ترقی میں ترجمہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ جس قوم نے دوسرے قوم کی علوم و فنوں اور ادب کو اپنی زبان میں منتقل کیا ان کی ادب میں وسعت کشادگی پیدا ہو گئی۔ اور اپنے ادب کو

۲: قومی سطح پر ترقی یافتہ اقوام وفنون وادبیات سے واقفت حاصل کرنے کی خاطر۔

۳: گھٹن کے خلاف۔ تازہ ہوا کی جستجو کے خاطر جب پابندی یاں حد سے بڑھ گی تو افسانوں، نظموں اور دیگر اصناف میں تراجم ہونے لگتے ہیں۔ جن میں پابندیوں کے خلاف آواز بلند کر کے دوسروں کو آگے کرناچاہتے ہیں۔ یادوسروں سے حوصلے لیتے ہیں۔

۴: تخلیقی، صنفی، نثری اور شعری ضروریات کے تحت تراجم ہوتے ہیں" (ای ض اَص ف ح ۲۰۱۰ء)

دیگر اقوام کے فنوں وادبیات اور دیگر شہ پاروں سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر علم کے شیداؤں نے کتب کے تراجم کرائے عرب، عجم، مشرق اور مغرب سب کا مقصد اپنی علم ودانش میں اضافہ کرنااور اپنے علم کو دوسروں تک پہنچاناتھا۔

"تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتاہے۔ کہ ایران کے فرمانروابغداد کے عباسی خلفاءاور مصر کے فاطمی خلفاء علم وادب کے خاسے رسیاتھے اور اُنھوں نے نہ صرف دنیاکے نامور شہ پاروں کو عربی زبان میں ترجمہ کروایابلکہ اپنے زیر کنٹرول علاقوں میں لائبریری قائم کیں۔ بغداد کا بیت الحکمت اور مصر کی بیت الحکیم جیسی لائبریری اپنی مثال آپ ہی ہے"

(www.Janan-e-urdu.com>urdu-liturer)

اس بیان سے یہ بات واضع طور پر کہاجاسکتاہے کہ ترجمہ کی تاریخ آج سے نہیں بلکیں اب سے ہزاروں سال پہلے ہوچکی تھی اور آج اس جدید دور میں اس میں اضافہ ہورہاہے۔ ترجمہ کی افادیت کااندازہ ہم اس بات سے بھی لگاسکتے ہیں کہ اگر اُس زمانے میں چندایک نایاب کتابیں جواپنی خستہ حالت کی بناپر کبھی بھی ضائع ہوجاتے مگر ترجموں کی بدولت آج انکے نسخے ہم تک پہنچ گئے ہیں جیسابیان ہے کہ

"اگر سقراط، افلاطون اور بقراطس کی ہزاروں سال پرانی تصانیف کا عربی زبان میں ترجمہ نہیں ہوتاتو یہ قیمتی سرمایہ روم اور یونان کے پرانے کھنڈروں میں داب کر غارت ہوگیاہوتا۔ یورپ اور اشیاء کے ایوانوں میں آج ان کی گونج سنائی نہیں دیتی اس کی مثال بوعلی سینا، ابونصر فارابی، ابن رشید، ال ادریس کے کارنامے بغداد، غرناطہ اور یروشلم کے کتب خانوں میں ضائع ہوجاتے اگر یورپی زبانوں نے انہیں اپنے قالب میں ڈال کر چراغ جلانے کاسلسلہ جاری نہ رکھاہوتا۔"

(www.Janan-e-urdu.com>urdu-liturer)

ان تراجم سے مختلف زبانوں میں تہذیب، طب، ثقافت، تاریخ، فلسفہ، ادب اور سائنس منتقل ہوتاگیااوراس سے دنیاکی تمام ثقافت کاایک دوسرے سے ربط ہواجس سے ایک دوسرے کی تاریخ کوجاننے کاموقع فراہم ہوااس لئے کہاجاتاہے کہ

"ترجمہ دومختلف تہذیبوں کے مخصوص رویوں کے روبروہونے کاعمل ہے۔ بلکہ یہ ایک تہذیبی مزاج کااور دوسری تہذیبی شخصیت کاتعارف ہے"

(جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵) ترجمہ روایت اور فن، صفحہ نمبر ۱۹)

’’ترجمہ فی نفسہ اصل کی محض نقالی یا بھونڈا چربہ ہوتا ہے۔‘‘(نیو طالسطانی / حمید شاہد،(۱۹۹۳)جنگ اور امن، جلد اول، صفحہ نمبر ۲۸)

جب تک نظریں کچھ نہ دیکھیں اس کے بارے میں سوچنا، کرنا یاد کھانا وجود میں نہیں آتا۔ اداکاری میں کردار مکالمے کے زریعے کوئی پیغام دیا جاتا ہے۔ مصور میں تصویر کے زریعے محبت اور نفرت رنگوں کے زریعے دیکھتا ہے۔ اس طرح مترجم بھی کسی تصنیف سے متاثر ہو کر اس کو اپنی زبان میں منتقل کرتا ہے۔ لیکن اصل کی نقالی کے لیے بھی وہی جذبات اُبھرنے چاہیئے جو تخلیق کار میں اُبھرے تھے۔ تب ایک ترجمہ تخلیق کا ہم پلہ ہو سکتا ہے۔

’’اسی طرح اصل کی ایک نقل ہے۔ جیسے بیلے رقص یا مصوری یا اداکاری بیلے میں بدن کے لوچ سے مصوری میں قلم سے اداکاری میں جسم اور آواز کی حرکات وسکنات سے اصل خیال کا ہوبہ ہو ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ترجمے میں زبان دانی کی صلاحیت سے ہے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت کی کوئی نقالی ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس نقل کرنے والے کا جذب اندرون شامل نہ ہو وہ اداکاری بے روح ہو گی۔ جو اصل کردار کو اپنے اندر جزب کر کے خوب رچا کر پھر سے ایک نئے وجود کو جنم دیتی۔ جس میں اصلیت اپنی تمام خصوصیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے اور نقل کا یا نقل کرنے والے کا اپنا وجود نظروں سے اوجھل ہو جائے‘‘۔

(صوبیہ، سلیم ڈاکٹر،(۲۰۱۲)فن ترجمہ کاری (مباحث)صفحہ نمبر ۷۴)

ترجمہ کی ضرورت وافایت:

جب زبان حروف تہجی میں ڈھل کر تحریری شکل میں آگے بڑھی تو ترجمہ کا پہلا اور مضبوط نیو مذہبی تراجم بنے۔ سب س ے ع م د ہ م ث ال ق ر آن م ج ی د ہ ے۔ ج و د ن ی ا ک ے ت ق ر ی ب اَ ت م ام زب ان م ی ں ت ر اج م ہ و ا ہ ے۔ اس ک ی و ج ہ ی ہ ہ ے ک ہ ت ر دنیا کے کونے کونے تک نہیں پہنچ سکتی۔ مذہبی کلام سے لوگ بے بہرہ ہوتے۔

’’ترجمے کی ضرورت کی بات جب ہوتی ہے تو میرا ذہن شاہ عبد القادر کا قرآن کی ترجمے کی طرف جاتا ہے۔ شاہ صاحب کو قرآن کو ترجمے کی ضرورت کیوں پڑی تھی۔ شاہ صاحب سے پہلے یورپی مشنریوں نے بائبل کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان دونوں نقطہ نظر میں یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ عیسائی مشنریوں اور شاہ عبد القادر دونوں کا ترجمے کے بارے میں مقصد اور ضرورت یکسان تھا۔ وہ ایک عام آدمی تک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب کے مفہوم اور پیغام کا پہنچانا تھا۔ جسے بعض مشکلات کے باعث تمام آدمی جاننے اور سمجھنے سے قاصر تھا‘‘۔

(جیلانی، کامران پروفیسر (۱۹۸۵)ترجمہ روایت اور فن، صفحہ نمبر ۱۹)

قدیم اور جدید دور میں دیکھیں تو ترجمہ چار وجوہات کی بنا پر ہوا اور ہو رہا ہے۔

ا: مذہبی سطح پر تاکہ لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا جاسکتے۔

ترجمہ کی بدولت ہاتھ آیا ہے۔ ترجمہ کا دامن وسیع ہے اس میں تمام علوم کو جگہ ملی ہے ادب، سائنس، فلکیات، تاریخ، مذہب، فلسفہ، فنون ولطیفہ وغیرہ شامل ہیں۔ ترجمہ کے باقاعدہ ادارے قائم ہیں ترجمہ کے حوالے سے رسائل بھی نکل رہے ہیں۔ ترجمہ کا عمل قدیم سے لے کر جدید تک جاری وساری ہے۔

ترجمہ کی تاریخ:

ترجمہ کی ابتداء اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسان کی پیدائش۔ انسان کی وجود کے ساتھ اس کی ضرورت بھی جوڑی تھی جب انسان نے اپنی بقاء کی کوشش کی تو دیگر عناصر کے ساتھ زبان اور ترجمہ بھی شامل تھے۔

”جب کوئی انسان کسی دوسرے کو اپنا مدعا اپنے دل کا حال اور ماضی الضمیر بیان نہیں کر پائے گا۔ تو کیسے اگلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہوگا؟ یقیناً شروع میں ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا لوگ اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے ہوں گے۔ اور اُس دوران کچھ مخصوص اقسام کی آوازیں بھی شاید اُنھوں نے وضع کرلی ہوں گئی۔ جن کی مدد سے وہ سماجی رشتے قائم کرنے میں کارہے ہوں گے۔“

(www.Janan-e-urdu.com>urdu-liturer)

ظاہر ہے شروع میں زبان سے انجان لوگ اپنی ضرورت کے تحت تصویروں اشاروں اور بعد میں صوتی طریقہ سے اپنا مدعا بیاں کرتے تھے۔

Translation theory was regarded as a part of linguistic communication based on Information. This theory defines language as a code. During communication, speakers encode what they want to say and the listeners or reader who share the same code. (Translation studies; A brief history of the discipline)

اس طرح انسانی ضرورت خاص کر تجارت اور سیاحت نے ترجمہ کو فروغت دی۔ جب دوملکوں کے درمیان تجارت ہوتی ہو ان کے ترجمان مقرر ہوتے جو دونوں زبانوں سے عبور رکھتے۔

”ان تجارتی ایوانوں کے لیے جنھیں Douane (دیوان) کہتے تھے۔ اور وہ تمام غیر ملکی تجارت کرنے والی بندرگاہوں میں قائم تھے۔ تمام تجارتی کاروبار انہی ترجمانوں کی وساطت سے ہوا کرتا تھا“

(اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (۱۹۶۲)، صفحہ، ۲۰۲

کسی زبان کے الفاظ یا تحریر کو اپنی زبان میں لکھنا ترجمہ کہلاتا ہے۔ ترجمہ کا لفظی معنی ترجمانی ہے۔ کسی مصنف کے خیالات کو لیا جائے۔ ان کو اپنی زبان کا لباس پہنایا جائے۔ ان کو اپنے الفاظ ومحاورات کے سانچے میں ڈالا جائے اور اپنی قوم کے سامنے پیش کیا جائے کہ ترجمے اور تالیف میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔ (حاجی، احمد فخری، (۱۹۲۹) اردو رسالہ، تاکدیم ۱۰) ترجمہ اصل کی نقل ہے۔ یہ نقل کی طرح ہو سکتی ہے۔ یا اس سے بہتر یا کمتر بھی۔ لیکن ہر حال ان کا مقصد معلومات دینا ہے۔

ترجمے کی اہمیت اور ضرورت قدیم سے جدید تک

[3]شہناز بی بی [4]زینت ثناء [5]خالد خٹک

Abstract:

The aim of this study is to present an outline of a translation. Translation studies starts with a brief description of the bearing which have language studies. The idea of the translation is to provide the thought of other writers. The study of translation can be divided into two parts one of them is called theoretical and other is ideological. Translation doesn't mean to covert the word to another word but the actual aim of translation is to convert emotional beliefs, thoughts, culture, and their traditional object of civilization code. The main object of the translation is to provide the world's best books of their own language. In this research study I focus the aim and objects of the translation and also its importance of translation in language and literature.

Keywords:

Brief description, Code, Civilization, Literature, Ideology Emotions

تعارف:

ترجمہ کی ابتداء انسان کی پیدائش کے ساتھ ہوئی ہے شروع شروع میں انسان اپنی ضرورت اور خیالات کو ظاہر کرنے اور تعلقات رکھنے کے لیے ترجمہ کو وسیلہ بنایا گیا۔ اشاروں میں ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھنا ہی ترجمہ کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد تصویروں، اشاروں کے زریعے خیالات کا اظہار کرنا زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے سے تعلق رکھنا تجارت کے حوالے سے ترجمہ کو زریعہ بنایا گیا۔ باقاعدہ ہر ملک اور معاشرہ کے ترجمان ہوا کرتے تھے ترجمان کے وسیلے سے ملکوں میں تجارت ہوا کرتی ہے۔ ابتداء سے لے کر اب تک تجارت زریعہ ترجمہ ہی ہے۔ مذہب کو پھیلانا اور دیگر مذاہب کے فرق کو واضع کرنے کے لیے ترجمہ کو اپنایا گیا۔ ترجمہ کی بدولت مذاہب کو پھیلانے میں آسانی ہوئی تمام علوم ترجمہ کی بدولت زندہ ہیں۔ جس زبان میں لین دین کا دامن وسیع ہو گا وہ زبان وسعت کے میدان طے کرتا جائے گا۔

ادب میں ترجمہ باقاعدہ ایک صنف ہے ترجمہ کی بدولت ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ دنیائے ادب میں واقفیت کا بہتریں زریعہ ترجمہ ہے۔ اُردو ادب کے دامن میں دنیائے ادب کے پھول نظر آئیں گے۔ اردو ادب کا زیادہ تر سرمایہ

---

[3]PhD Scholar University of Balochistan Quetta Pakistan
[4]Professor Department of Balochi University of Balochistan Quetta Pakistan
[5]Professor and Chairman Department of Urdu University of Balochistan Quetta Pakistan

Mohar Ali Muhammed, Dr. “The Qur’an and Orientalists”, p331.341-
Polmar,e,h”The Koran”,P 39-

George, sale “The Koran” (New York,1890) p:49

3. القرآن 1: 106
4. الازہری ، پیرکرم شاہ ،"ضیا النبی" (لاہور: ضیا القرآن پبلی کشنز ،سن ذیعقدہ 1418ھ) جلد ششم ص 413
5.

George, sale “The Koran” (New York, 1890) p: 49.

6. ضیاءالنبی ص نمبر447تا458
7. االیضاً۔:2
8. القرآن14:14
9. القرآن49
10. زقزوق، محمود حمدی دکتور"الاستشراق والخلیفہ الفکریہ للصراع الحضاری"(قاہرہ:دارالمنار،سن 1989)ص10
11. ایضاً، ص109
12. ضیاءالنبی،ص447تا465

George sale, “the Koran “Rredrik Waran and Company New York-1890 p 8 to 47.

was stuck with admiration immediately. Professed the religion taught there by declaring that such word could from an inspired person only30) .”)

ترجمہ: یہاں بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ظاہر کرنے کے لیے پیش کروں گا۔ کہ اس کتاب کے اسلوب کی تعریف وہ لوگ بھی کرتے تھے۔ جن کو اس کتاب کے متعلق فیصلہ کرنے کے لیے اہل اور موزوں جج قرار دیا جاسکتا ہے۔ لبید بن ربیعہ جو محمد ﷺ کے زمانے کے عظیم عرب شعراء میں سے ایک تھا ،اس کی ایک نظم خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کی گئی۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا۔ جو صرف ان ادب پاروں کو حاصل ہوتا تھا۔ جن کے مقابلے کی دوسرے شعراء میں ہمت نہ تھی، یا نہ ہوتی تھی۔ جلد ہی لبید کی نظم کے ساتھ قرآن کی دوسری سورۃ آویزاں کر دی گئی۔ لبید اس سورت کی ابتدائی آیات پڑھ کر ہی اس کے لیے سراپا تعریف بن گئے اس نے فوراوہ دین قبول کر لیا جس کی تعلیم وہ سورۃ دے رہی تھی۔ اور ساتھ ہیاعلان کیا کہ یہ کلام صرف ایسے شخص کیزبان سے نکل سکتا ہے۔ جس پر خدا کی طرف سے وحی آتی ہو۔(31)

References:

George sale,” The Koran” (New York: red brick warm and company, 1890) p: 48.

Mohar Ali Muhammad, Dr,“The Qur’an and Orientalists”(jam’iyat ‘ihyaa’minhaaj al-sunnah,2004) p:331

Rod well, j.m “The Koran” (New York: jm) preface.AuthorJeffery”, The Koran “The Koran selected suras translated heritage” (New York press,1958) p:19

Mohar Ali Muhammad, Dr, “The Qur’an and Orientalists”, p332:
ibid p: 331

1. القرآن 1:1

Sweet Man,j,”Islam and Christian theology”,(latter worth London ,1945) vol,p :5-

Mohar Ali Muhammad, Dr., “The Qur’an andOrientalist”, p331.335-

2. القرآن 19: 20

Ghulam Sarwar, Hafiz, “Translation of Holy Quran” p: xxx111

لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔دنیا میں کوئی مسلمان جماعت ایسی نہیں۔جو قرآن کی روایت بالمعنی کو جائز سمجھتی ہو۔تمام مسلمانوں کا ایمان ہے۔کہ قرآن حکیم کے الفاظ اور معانی دونوں منزل من اللہ ہیں۔اور دونوں تواتر کے ساتھ مروی ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔اختلاف قراءۃ کی حقیقت کو ہم نے سطور بالا میں تفصیل سے بیان کیاہیں۔۔روایت بالمعنی کے جائز ہونے کا مطلب تو یہ ہے۔کہ قرآن حکیم کے الفاظ کو عام انسانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔قرآن کی وہی کفیت ہوتی جو اناجیل کی ہیں۔کہ ایک ہی واقعہ کو" متیٰ" نے کس طریقے سے بیان کیاہیں۔

اور "مرقس "نے اس سے الٹاراستہ اختیار کیاہے۔اگر بالفرض روایت بالمعنی کی اجازت دی جاتی۔تو الفاظ انسانی ہوتے اور ان کی نظیر پیش کرناانسانوں کے لیے ناممکن ہوتا۔قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عربوں کا چودہ سوسال قاصر رہنااس بات کی دلیل ہے۔کہ قرآن کے معانی،الفاظ اور عبارات سب الہامی ہیں۔اور کسی انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اس کی نظیر پیش کر سکے۔لہذا مستشرقین کا یہاعتراض

بھی دوسرے وسوسوں کی طرح ایک وسوسے سے زیادہ کچھ حثیت نہیں رکھتاہے۔

قرآن کا چیلنج اور آپ ﷺ کے وقت کے شعراء کا تاثیر قرآن قبول کرنا

اگر تمھیں شک ہے تو لے آو ایک سورۃ یااس کے مثل جو ہم نے اتارہ اپنے بندہ پر اور بلالے آو اپنے شرکاء کو اللہ کے سوا،اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو قرآن نے مختلف جگہوں میں تمام انسانوں کو چیلنج کیاہے۔اگرچہ مستشرقین اس قرآن کو حضرت محمد ﷺ کی ایجاد مانتے ہیں۔اللہ کا کلام نہیں مانتے۔جارج سیل اپنے قارئین کو یہ بتاناچاہتے ہیں کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے۔کہ قرآن کی مثل پیش کرناانسانوں کے لیے ناممکن ہیں۔حالانکہ حضور ﷺ نے اس قرآن حکیم کو اپنے دعویٰ رسالت نبوت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھااور تمام انسانوں کو چیلنج کیا۔حالانکہ بہت سارے ایسے فصیح اللسان تھے۔جنھیں اپنے ادب ،لغت پر ناز تھا کہ اس طرح ایک سورہ بنا کر لائے۔جارج سیل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایسی کتاب لکھی کہ لوگوں کو چیلنج کرنے کے باوجود ایسی کتاب لانہ سکے۔بلکہ اس سے متاثر ہوئے اور ایمان لے آئے۔مستشرقین تو یہ نہیں مانتے کہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اس لیے کہا کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے۔کہ انسانوں کے لیے ممکن نہیں کہ قرآن کی مثال پیش کر کے لائے۔اپنے قارئین کو یہ باتیں بتانے کے بعد جارج سیل ص نمبر 47 پر لکھتاہے۔

"I will mention but one instance of several to show that book was really admired for the beauty of its composure by those who must be allowed to have been competent judges, a ॰poem of labid-ebn- rabia,One of greatest wits in Arabia in Muhammad’s time ,being fixed up on the gate of the temple of Mecca ,an honor allowed to none but the most esteemed performances, none of other poet durst offer anythingof their own in competition with it. But the second chapter of Quran being fixed up by it soon after Labid himself (then an idolater) on reading the first verse only

قرآتیں تھیں۔ ان کی نوعیت وہ نہیں تھی۔ جو مستشرقین ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ پتہ چل جائے کہ اختلاف قراءت کی نوعیت کیا ہے۔ اختلاف قراءت سے معنی تبدیل نہیں ہوتا بلکہ معنی میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔

مثلاً قرآن کی آیت نمبر 6 الحجرات میں لفظ "فتبینوا" آیا ہے۔

"یا ایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق بنبا ءفتبینوا ان تصیبوا قوما بجھالۃ"۔ (26)

ترجمہ: اے ایمان والو! اگر آئے تمھارے پاس کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی قوم کو بے علمی میں۔

اس آیت کے لفظ " فتبینوا" کو حضرت حفص کے علاوہ دوسرے حضرات نے فتبینوا پڑھا ہے۔ فتبینوا کا معنی تحقیق کرنا اور معاملے کی چھان بین کرنا۔ اور "فتثبتوا" کا معنی بھی اس کے بالکل قریب ہے۔ المنجد میں تثبت کا معنی لکھا ہے۔ تثبت فی الامر والرای تاءنی فیہ وفحص منہ یعنی کسی معاملے میں جلد بازی کرنا اس رائے کے متعلق مشورہ کرنا اور اس کی تحقیق کرنا۔ قارئین کرام سمجھ سکتے ہیں۔ کہ یہاں اختلاف قراءت سے مفہوم میں قطعاً کوئی تبدیل نہیں آئی۔ بلکہ اختلاف قراءت سے مفہوم میں وسعت آگئی کہ جب مسلمان کوئی مشکوک خبر سنیں وہ اس کے مطابق عمل کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ بلکہ باہم مشورہ کریں۔ معاملہ کی خوب تحقیق کریں اور جب معاملہ بالکل واضح ہو جائے تو پھر کاروائی کریں۔ اختلاف قراءت کا مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ اس کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ یا ایسا نقل ہے جو دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اختلاف قراءت میں حکمت ایک یہ بھی ہے۔ کہ اس سے آیات کے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے زندگی کے بے شمار مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔(27)

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ مختلف قراءتوں کے ہونے کے باوجود تمام اُمت مشرق سے مغرب تک ایک ہی قراءت پر ساری امت جمع ہے۔ لیکن دوسری قراءتیں بھی تفسیر اور احادیث کی کتابوں میں تواتر کے ساتھ نقل ہوتی آرہی ہے۔ ان سے علماء کرام استنباط مسائل کا کام لیتے رہے ہیں۔ عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم کا آپس میں اختلاف ہے۔ اس کا قرآن سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی کوئی نسبت ہے۔ قرآن کریم اگرچہ سات قراءتوں میں نازل ہوا ہے۔ لیکن اس امت کو یا اس سے قرآن کی شان اعجاز میں کمی نہیں ہوتی ہے بلکہ شان اعجاز اسی طرح قائم رہتی ہے۔ جس طرح تھی۔ مستشرقین نے یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہیں۔ کہ مسلمان روایت بالمعنی کو جائز قرار دیتے ہیں۔(28)

اپنے اس مفروضے کو بھی انھوں نے قراءۃ بالسبعہ سے جوڑنے کی کوشش کی ہیں۔ کہ مسلمان روایت بالمعنی میں آزاد ہیں۔ اس لیے تو سات قراءۃ وجود میں آئی ہے۔ اور روایت بالمعنیٰ کی آزادی کے ماحول میں قرآن حکیم کی تدوین کا کام مکمل ہوا۔ ان کا مدعا یہ ہیں۔ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ جب روایت بالمعنیٰ مسلمانوں کے ہاں مسلم ہیں۔ تو قرآن کے الفاظ میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے۔(29)

"مذکورہ بالا پیراگراف میں جارج سیل قرآن کے سات قرات کو "سات ایڈیشن" کا نام دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ قرآن کے ایڈیشنوں کا ذکر کرنے کے بعد قارئین کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا مناسب نہ ہو گا۔ کہ قرآن کی ابتدائی ایڈیشن سات ہیں۔ اگر ان کو ایڈیشن کہنا مناسب ہو یا ہم اس کو اس کتاب کی سات نقلیں کہہ سکتے ہیں۔ جن میں دو مدینہ میں شائع ہوئیں۔ اور وہیں استعمال ہوتی تھیں۔ تیسری مکہ میں ،چوتھی کوفہ میں، پانچویں بصرہ میں، چھٹی شام میں، ساتویں نقل کو عام ایڈیشن کہہ سکتے ہیں"۔

جارج سیل نے قرآن حکیم کی تاریخ کہاں سے اخذ کی ہے۔ اس کے بارے میں کہنا اپنی طرف سے اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی ہم کچھ سکتے ہیں۔ بہر حال ان صاحب نے جن شہروں کے ساتھ قرآن کے ایڈیشنوں کو منسوب کرنے کی کوشش کیہیں۔ دور رسالت میں تو ان میں اکثر شہر اسلامی قلمرو میں شامل نہیں ہوئے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک لوگ مختلف قراءتوں میں لہجوں میں قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے لغت قریش کے مطابق قرآن حکیم کے مختلف نسخے تیار کروا کے مختلف شہروں کو روانہ کئے جو اسلامی قلمرو کا حصہ تھے۔ غالباً جارج سیل نے قرآن حکیم کی سات قراءتوں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مختلف شہروں میں قرآن حکیم کی نقلیں بھیجنے کے مختلف مضامین کو اکٹھا کر کے اپنے تخیل (سوچ) کے زور پر ایک اضافہ گھڑا ہے۔ اور وہ یہ تاثیر دینے کی کوشش کی ہیں۔ جس طرح بائبل کی مختلف ایڈیشنز ہے۔ اور ہر ایڈیشن دوسرے سے مختلف ہے۔ 2015 کا ایڈیشن 2016 سے مختلف ہے۔(23)

اس طرح پروٹسٹنٹ کا بائبل، کھیتولک کے بائبل سے اور کھیتولک کا بائبل (آرتھوڈکس) کے بائبل سے مختلف ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا قرآن بھی ایک علاقہ کا مختلف ہے۔ جو مدینہ کا ہے وہ مکہ کا نہیں ہے اور جو مکہ کا ہے وہ عراق کا نہیں ہے۔ اگر بفرض محال مختلف قرآن صحابہ کے دور میں مروج ہوتی۔ تو آج ہزاروں کی تعداد میں مختلف قسم کے قرآن موجود ہوتے۔ لیکن 14 سو سال گزرنے کے باوجود جو قرآن افریقہ میں ہے۔ وہی آج برصغیر پاک وہند ہے۔ جو براعظم امریکا میں قرآن ہے۔ وہی قرآن براعظم یورپ میں ہے کوئی اختلاف نہیں ہے۔(24)

اس کی وجہ یہ ہیں کہ اس کا ذمہ اللہ رب العزت نے خود لیا ہے۔

"انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون"۔ (25)

ترجمہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

مستشرقین میں سے جارج سیل نے قرآن حکیم میں اختلاف کے مفروضوں کا محل تعمیر کرنے کے لیے قرآن حکیم کی سات قراءتوں کو بنیاد بنایاہیں۔ وہ قرآن حکیم کی سات قراءتوں کے الفاظ پر زور دیتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہیں کہ قراءتوں کے اختلاف کی نوعیت کیا تھی۔ ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دور میں مختلف

جارج سیل کا قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام ماننے کی بجائے محمد ﷺ کی تصنیف قرار دینا:

جارج سیل" قرآن" کے متعلق اپنا آخری فیصلہ اپنی کتاب "دہ قرآن" کے صحفہ نمبر 50۔۔51 میں صادر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"The Mohammed was really the author and chief contriverof the Koran is beyond dispute though it is highly probable.That he had no small assistance in his design from other(as his country man failed not to object to Him. However they differed so much in their conjecturesas to particular person who gave him such assistance. That they were not able, it seemsto prove the change Muhammad, and it is to be presumed having taken his measures to well to be discovered"

مصنف اور اختراع کرنے والے، جھگڑے سے دور ہے اگر چہ اس بات کا غالب امکان ہیں۔ کہ دوسروں سے انہیں یعنی محمد ﷺ کو کم مدد نہیں ملی۔ اپنے منصوبے میں جیسا کہ ان کے اہل وطن ناکام ہوئے ان پر اعتراض کرنے میں ۔ اگر چہ وہ اپنے مفروضوں میں ایک دوسروں سے مختلف تھے۔ اس مدد میں جن مخصوص آدمیوں نے کردار ادا کیا۔ اس مخصوص آدمیوں کے حوالے سے ان میں اختلاف تھا کہ وہ اس قابل نہ تھے۔ اس کو فرض کرنا ہو گا یا یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ الزام کو ثابت کرنا محمدؐ پر آسان نہ ہو گا بلکہ اس سے لگتا ہے۔ کہ محمد ﷺ نے اس معاملے کو خفیہ رکھنے کے لیے اتنے عمدہ اقدامات کئے ہیں۔ کہ ان کی وجہ سے اس راز کا انکشاف ممکن نہ تھا۔

اس مندرجہ بالا پیرا گراف میں جارج سیل یہ الزام لگاتا ہیں۔ کہ کہ قرآن کے مصنف محمد ﷺ ہی ہیں۔ ان کو ایجاد کرنے والے محمد ﷺ ہیں۔ اگر چہ اس بات کا غالب امکان ہیں کہ دوسروں سے انھیں کم مدد نہیں ملی اپنے منصوبے میں جیسا کہ ان کے اہل وطن ناکام ہوئے ان پر اعتراض کرنے میں۔(21)

قرآن کے مختلف قراءۃ کے بارے میں جارج سیل کا نظریہ:

جارج سیل اپنی کتاب" The Koran" کے صفحہ نمبر 45 میں مختلف قراۃ سبعہ کو ورژن یا ایڈیشن کا نام دیتے ہوئے کہتے ہے۔

"Having mentioned the different editions of the Koran ,at may not be amiss here to acquaint the reader that there are seven principle edition, if I may so call them or ancient copies of the book two of which were published and used at Madinah ,a third at Mecca a fourth at chufa ,fifth at Basra ,a sixth at Syria and a seventh called the common or vulgar"- (22)

"اکثر کہانیاں یاان کے کچھ حالات کو عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید سے لیا گیا ہے۔(الزام)یہودیوں اور عیسائیوں میں مروج تھی۔ان غیر مستند انجیلوں کے قصے کہانیاں کو پیش کیا گیا ہے۔بائبل کے بیانات کے خلاف،اسی طرح یہودیوں اور عیسائیوں پر الزام بھی لگایا ہے۔۔کہ انھوں نے عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں تبدیلیاں کی ہے۔جارج سیل اپنی کتاب میں لکھتا ہے۔کہ مجھے یقین ہے کہ کچھ یا بالکل نہ ہونے کے برابر روایات یاان کے کچھ حالات قرآنمیں ہے جو کہ محمد ﷺ نے ایجاد کیے تھے۔جو کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔کہ محمد ﷺ کی روایات ہے۔(الزام)کہ قرآن میں وہ چیزیں آج نہیں ہے جو محمد ﷺ نے بتائی تھی)لیکن وہ بیانات جو محمد ﷺ نے پیش کئے تھے وہ قرآن سے پہلے مصادر میں باآسانی سے مل سکتے ہیں۔اس بات سے جارج سیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اصل مصادر عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم ہے"۔(16)

آپ ﷺ پر جارج سیل کے الزامات کی بھوچاڑ:

جارج سیل نے صحفہ نمبر 49 میں الزامات کی بھوچاڑ کی ہیں۔سب سے پہلا الزام آپ ﷺ پر یہ لگایا کہ آپ ﷺ نے قرآن کے واقعات،حالات،عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم سے لئے ہیں۔اس سے بڑھ کر یہ کہا کہ انھوں نے غیر مستند انجیلوں سے روایات واقعات لئے ہیں۔تاکہ ان کو بائبل کے خلاف پیش کر سکے۔اور ان کو لے کر بائبل کے خلاف پیش کیا گیا۔مزید قرآن پر وار کرنے کے لیے،غیر محفوظ ظاہر کرنے کے آن جناب کہتے ہیں۔کہ دراصل محمد ﷺ نے جو باتیں ایجاد کی ہے۔ان میں کچھ یا بالکل مکمل طور پر اس موجودہ قرآن میں نہیں پائی جاتی ہیں۔ہاں وہ باتیں جو آپ ﷺ نے کی ہے ان کے حصول کے لیے آسان ذریعہ وہ عہد نامہ جدید اور عہد نامہ قدیم ہے۔

جارج سیل کے اس پیرا کا خلاصہ یہ ہے کہ گویا آپ ﷺ کی جتنی باتیں ہے وہ اصل میں بائبل سے ہی لی گئی ہے اور آج کل کا قرآن غیر محفوظ ہیں،آپ ﷺ کی باتیں اس میں نہیں پائی جاتی۔(17)

مسئلہ ناسخ و منسوخ کے بارے میں جارج سیل کا نظریہ:

جارج سیل اپنے "ترجمۃ القرآن" کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

"قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں۔جو باہم متضاد ہیں۔مسلمان علماء نسخ کے اصول کے ذریعے ان پر وارد ہونے والے اعتراضات کا تدارک کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے قرآن حکیم میں کچھ احکام صادر کئے۔جن کو بعد میں معقول وجوہات کی بنا پر منسوخ کر دیا گیا"۔(18)

اپنے اس دعوی کو ثابت کرنے کے لیے وہ قرآن کی اس آیت کو پیش کرتے ہیں۔

"ما ننسخ من ایت او ننسها ناتبخیر منها او مثلها"(19)

جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں۔یا فراموش کرا دیتے ہیں۔دوسری بہتر اس سے یا کم از کم اس جیسی۔(20)

Palomar says that sales translation can scarcely to regard as a fair representation of the Quran. (13)

جارج سیل کے ترجمۃ القرآن کی شہرت کا راز:

جارج سیل نے سابقہ تراجم کی نسبت اپنے ترجمۃ القرآن میں بہت زیادہ اسلام اور قرآن کو بدنام ورسوا کرنے کی مذموم جسارت کی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یورپ میں اسی ترجمہ کو مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ ترجمہ مختلف یورپی زبانوں میں کئی بار شائع ہوا۔

قرآن کے معجزہ کا اقرار اور انکار:

جارج سیل نے صحفہ نمبر 49 پر جو ذکر قرآن سے متعلق کیا ہے ایک طرف تو اس کو محمد ﷺ کی تخلیق قرار دیتے ہے جبکہ دوسری طرف اس کے معجزہ کا اقرار بھی کرتے ہے کہ یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے۔ جو انسانی ہاتھوں سے نہیں لکھی جا سکتی ہے۔

"Although George sale saysin his book on page 49, that the Koran is the creation of Muhammad but this is such a creation that the humans pen can 't write, its miracle which review to dead's evenit's greater than it" (14)

جارج سیل اگرچے کہتے ہیں۔ کہ یہ قرآن "محمد ﷺ "کی تخلیق ہے، لیکن کہتے ہیں۔ کہ قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا ہیں۔ یہ مستقل معجزہ ہے۔، جو مردوں کو زندہ کرنے کے لیے معجزے سے بلند تر ہے۔

قرآن کو غیر مستند انجیلوں کی روایتوں سے لینا بقول جارج سیل

جارج سیل اپنی اسی کتاب(The Koran) میں صفحہ نمبر 49 پر لکھتا ہے۔

"Several of which stories or some circumstances of them are taken from the old and new testament ,but many more from the apocryphal book s and tradition of the Jews and Christians of those ages ,set up in Koran as truth in the opposition to the scriptures which the Jews and Christian are charged with having altered and I am apt to believe that few or none of the revelation or circumstances in the Koran were invented by the Muhammad as is generally supposed it being easy to trace the greatest part of them much higher".(15)

جارج سیل نے مراسی کے تتبع میں تفسیری فقرے بھیمتن میں لکھے ہیں۔ جارج سیل نے ترجمہ کو تیار کرنے میں دوسروں سے معاونت لی ہیں۔(9)

جارج سیل کا عربی زبان کو جاننا بقول حافظ غلام سرور:

حافظ غلام سرور کے نزدیک جارج سیل عربی زبان کی لغت جانتا تھا۔ اگر عربی لغت نہ جانتا تو ترجمہ کے لیے بدترین الفاظ کا انتخاب نہ کرتا۔ جیساکے اس نے بہت سے مقامات پر کیا ہے۔ ا س کا غلط ترجمہ لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس کے مفہوم کو مشکوک بنا سکے۔ لہذا اس کی بغض وعناد سے بھرپور طبیعت نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ قرآن مجید کی حیثیت کو متاثر کریں۔

قرآن مجید کی حیثیت کو متاثر کرنے کے لیے جارج سیل کے بدترین الفاظ کے چناؤ کی ایک مثال:

جارج سیل نے سورہ مریم آیت نمبر20 کے لیے بدترین الفاظ کا چناؤ کیا ہے۔

"قالت انیٰ یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اک بغیا(10)

Sale makesMarysays I am not harlot.

حضرت مریم علیہ سلام فرماتی ہے۔ کہ میں فاحشہ نہیں ہوں۔(نا اعُوذُ بللّہ)

جارج سیل کے منتخب الفاظ کا ترجمہ ہے۔ حالانکہ اس کا ترجمہ بہت مہذب انداز سے ہو سکتا تھا۔ جبکہ پورے قرآن میں اس طرح کا کوئی لفظ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ لہذا اقرآن کا اس انداز ے سے ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا ۔

جارج سیل اگرچے عربی لغت کو جانتے تھے۔ لیکن عربی محاورات سے ناواقف تھے۔(11)

جارج سیل کے ترجمہ " The Koran "میں موجود اغلاط کی نشاندہی کے حوالے سے ملاحظہ ہو۔

GHULAM SARWAR, HAFIZ," TRANSLATION OF HOLY QURAN" (LAHORE: NATIONAL BOOK FOUNDATION, 1973) P: 9...21.

جارج سیل کا ترجمۃ القرآن میں جنت اور دوزخ کا انکار:

جارج سیل قرآن مجید میں موجود جنت اور دوزخ کے ذکر کا بھی انکار کرتے ہے۔

"Thus definitely denies that the description of heaven in the holy Quran"(12)

پولر(مستشرق) کی جارج سیل کے ترجمۃ القرآن سے متعلق اظہار رائے:

"کہ جارج سیل اس بات کا دعویٰ کرتا ہے۔ کہ وہ سابق مستشرقین کی نسبت اسلام اور قرآن مجید پر زیادہ مہارت رکھتا ہے۔ اور بڑے جراتمندانہ انداز سے کہتا ہے کہ پروٹسٹنٹ ہی اسی لائق ہے کہ وہ قرآن مجید کو شکست دے۔"

"The protestant alone are able to attack the Quran with success and for them. I trust providence has reserved the glory of it overthrow". (2)

"جارج سیل کا یہ دعویٰ کہ اس نے قرآن مجید کا ترجمہ غیر جانبدارانہ انداز سے کیا ہے۔ غلط ہے یہ بات وہ اسلام اور قرآن مجید پر مکمل مہارت بھی نہیں رکھتا تھا"۔(3) چونکہ اس کا ترجمہ اس کے "ترجمہ قرآن" کی نقل ہے۔" (4) "لہذا اس کا یہ دعوی بھی کہ اس نے براہ راست قرآن مجید سے کیا ہیں، باطل ہو جاتا ہیں"۔(5)

جارج سیل کی عربی زبان میں مہارت آر۔اے۔ڈیون پورٹ کے زبانی:

جارج سیل کے ہم عصر جن لوگوں نے یہ کہا کہ جارج سیل نے ترجمہ کی تکمیل کے بعد اپنی زندگی کے 25 سال عرب میں گزارے۔ جہاں اس نے عربی لغت پر عبور حاصل کیا۔ جبکہ آر۔اے۔ڈیون پورٹ نے یہ نقطہ اٹھایا کہ جارج سیل کی تاریخ پیدائش 1697 ہیں اور وفات 1736 ہیں اور اپنے ترجمہ کے شائع ہونے کے دو سال بعد وفات پا گیا۔ اس سے یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ اس نے 25 سال عرب میں گزارے۔(6)

جارج سیل کے ترجمۃ القرآن کا مختصر جائزہ:

جارج سیل کے ترجمہ میں سے ایک مثال پیش کیا جاتا ہیں ۔ جس میں سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت کا غلط ترجمہ کیا ہے :
الحمدللہ(7)

جارج سیل نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ کہ Praise be to God جبکہ اصل ترجمہ یہ ہے (All the praise or all praise belong to Allah)(8)

جے۔ایم۔راڈویل(مستشرق) کی جارج سیل کے ترجمۃ القرآن کے غلطیوں کی نشاندہی:

سیل کے ترجمہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہیں ۔ کہ اس کا ترجمہ اس کی زندگی میں چھپا۔ اور یہ ترجمہ سب تراجم سے زیادہ صحیح تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے تمام اہل تحقیق اور اہل علم میں معتبر اور مشہور تھا۔ مگر اس میں جو نقص رہ گیا ہے وہ یہ ہے۔ کہ مترجم نے آیات کے لیے جو علامات لکھی ہے۔ اس کو حذف کر دیا ہے۔ اور تمام کتاب کو ایک مسلسل پیرایہ میں لکھ دیا ہے۔ اور یہ ایک بڑا نقص تھا۔ جس کی اہل علم نے بڑی شکایت کی ہیں اور ایک شکایت "جے۔ایم۔راڈویل" نے کی ہے۔ کہ

۔ جو لوگوں میں بہتر ترجمہ سے پڑھ گئی ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ پر وٹیسٹنٹ ہی کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں۔ اور بھروسہ ہے کہ قدرت نے پروٹیسٹنٹ کا انتخاب اس لیے کیا ہے ۔ کہ وہ قرآن کو شکست فاش دے دیں ۔

آپ ﷺ سے متعلق جارج سیل کا نظریہ :

جارج سیل "The Koran" جو کے 18 وی صدی میں انگلش میں لکھی جانے والی پہلی " ترجمۃ القرآن "ہیں۔ جس کے مصنف جارج سیل ہیں۔ اپنے ترجمۃ القرآن "The Koran" کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔

> "Muhammad seems not to have been ignorant of the enthusiastic operation of rhetoric on the mind of men; for which reason, he has not only employed his utmost skill in these his pretended revelation, to preserve the dignity and sublimity of style, which might seem not unworthy of the majesty of that being, whom he gave out to be the author of them; and to imitate the prophetic manner of the old testament; but he has not neglected even the other art of oratory; wherein he succeeded so well, and so strangely captivated the minds of the audience, the several of his opponents thought it the effect of which craft and enchantment, as he sometimes complains".(1)

کلام میں لفّاظی حاظرین کے ذہنوں پر زبردست اثر ڈالتا ہے۔ محمد ﷺ اس سے بے خبر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے نام نہاد الہامات میں اسلوب بیان (بیان کے طریقے)کو اس کے وقار، رفعت، کو قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی ہیں اور اپنی پوری صلاحیتں استعمال کی ہیں۔ تاکہ اس ذات کے قابل ہو جائے جس کی طرف وہ منسوب کرتے ہیں۔ اور اس طریقہ کار کو اختیار کیا ہیں۔ جو عہد نامہ قدیم کے پیغمبرانہ اسلوب سے یکساں ہو۔ آپ ﷺ نے تو فن بلاغت کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے اور انھوں نے اس حد تک اپنے مخاطبین کے اذہان کو ایسا گرویدہ بنایا کہ ان کے مخالفین نے انہیں جادو اور سحر کا اثر قرار دیا۔

اسلام اور قرآن سے متعلق جارج سیل کا بے باک انداز:

ڈاکٹر مہر علی محمد اپنی کتاب "The Quran and orientalist" کے صحفہ نمبر 331 پر فرماتے ہے۔

George Sale and the Holy Quran:

محمد ابراہیم درانی[1]

ڈاکٹر صاحبزادہ باز محمد[2]

Abstract:

The way George sale gets popularity about hisbook" The Quran" it is not hidden from any orientalist whether it is from our era or from any past century. Although he is ancestor of many biased orientalists. He born in 1697 in cent bury Kent,England - died in 1736, London, England) was an orientalist and practicing solicitor, best known for his 1734 translation of the Quran into English which is completely inconsistent, repugnant with belief of Islam. Allegation are leveled against Muhammad (PBUH).He tried time and again to prove that "The HolyQuran the book or the author of the holy Quran is prophet(PBUH). if we go through out his book or when you review George's book "The Koran" you will find out that there is biasness ,essence of prejudice which is poison for any researcher so I tried my level best to take out all facts which are not relevant ,blind shooting in the dark, which are just to show enmity nothing else . I tried to holdtightly Mr. George sale where he has left the rope of justice, neglected the principles of research, theprinciples of natural justice.

تمہید:

جارج سیل اٹھارویں صدی کا ایک مشہور مستشرق ہے۔ان کی شہرت کی اولین وجہ ان کا قرآن حکیم کا انگلش میں ترجمہ ہے۔ان کا "ترجمۃ القرآن" مستشرقین کیلئے علمی دستاویز کی حثیت رکھتاہے۔جس طرح مستشرقین کے آباواجداد کی روش رہی ہیں ۔کہ قرآن کو کسی نہ کسی طریقہ سے رسول اللہ ﷺ کی تصنیف قرار دیا جائے ۔جارج سیل بھی اپنی اس تصنیف میں اس بات کو ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے ۔عقل کے گھوڑے ہر جگہ دوڑانے کی کوشش کرتا ہے ۔اور اپنے صلاحیتوں کا لوہا منوانے کی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اس کا "ترجمۃ القرآن" مستشرقین کے لیے اہم علمی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔وہ "ترجمۃ القرآن" کے مقدمے میں قرآن حکیم کو آپ ﷺ کیتصنیف ثابت کرنے کے لیے اپنے تخیل کے اور قلمکاری کی ساری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہے۔ جارج سیل جنواں نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ اٹھارویں صدی میں کیا تھا۔اس ترجمہ کے حوالے سے سیل کہتا ہے کہ ان کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرناہیں

[1]M.Phil. Scholar Islamic Studies University of Balochistan Quetta Pakistan
[2]Chairperson Department of Islamic Studies University of Balochistan Quetta Pakistan